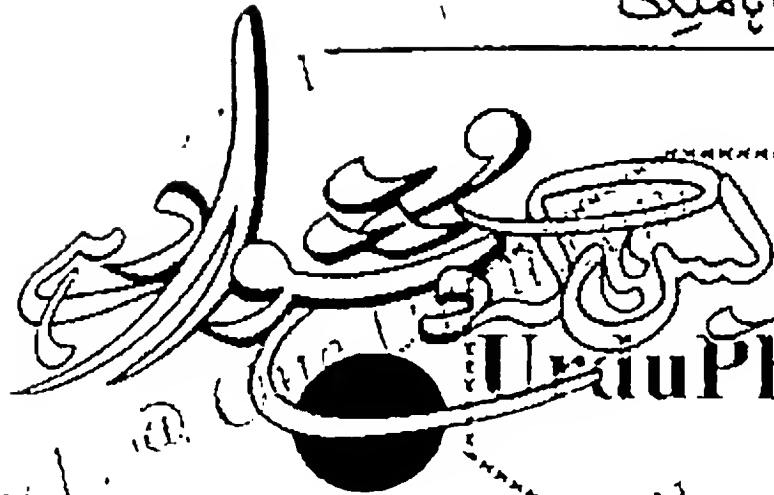


ماہنامہ



UrduPhoto.com

Urdu.com



۱۱۱
 واوی جان نے گھبرا کر اپنے ارد گرد ہاتھ مارے
 اور چشمہ مل جانے پر فحاشی اسے آنکھوں پر فٹ کیا
 پھر سامنے کھڑی لڑکی کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔
 وہ بے نیازی سے پنسل ہیل پر کھڑی ہاتھ میں پکڑی
 گاڑی کی چابی گھماتی رہی۔

مارے خیرت کے واوی کی رنگی ناک کی پھینٹ پر
 پہنچ گئی اور منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اپنی ڈریز میں تاج بیگم
 کچن سے برآمد ہو چکی تھیں۔
 ”ہائے آنٹی!“ وہ لڑکی آگے بڑھی اور تاج بیگم کے

گالوں سے اپنے گال مس کرتے گئی۔
 واوی کا منہ مزید کھل گیا۔ ”تھیں لپٹ لگتیں۔“
 تاج بیگم بھی بے تکلفی کے ان مظاہرین کی عادی نہ
 تھیں۔ وہ کچھ جھینپیں کچھ شرابیں
 ”دیکھو بیٹی!“ وہ بمشکل بویں۔
 ”ہوگا۔“

Ujala @ One Urdu

”ہاں مگر تمہیں اس سے کام کیا ہے؟“ واوی جو
 باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ دخل اندازی
 کیے بنا رہ نہ سکیں۔

”نہیں آنٹی! بس میں چلوں گی۔“ اس نے واوی کو
 قطعاً لفٹ نہ کرائی اور بدستور تاج بیگم سے محو گفتگو
 رہی۔ ”اؤ ہنر سے گزر رہی تھی تو سوچا بیچ کر لوں۔۔۔“
 ”کیا سوچا؟“ واوی کو اس کی بات پلے نہ پڑی۔ بڑی
 بے تالی سے انہوں نے اپنا چھا۔

”اگر ایک نگاہ غلط واوی پر ڈالی اور ان کی بات کا
 جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔“

”کوئی اچھا ہے؟“ پتی جاؤ بیٹی!“ تاج بیگم نے
 میزبانی کے تقاضے نبائے۔

”ارے ہو! اس سے پوچھو آخر اسے کام کیا ہے؟“
 ہمیں بھی تو دیکھنا چاہیے۔ ہمارا بچہ ہے وہ۔“

”نہیں آنٹی! تھینک یو!“ اس نے پھر تاج بیگم سے

Ujala @ One Urdu

ناولٹ

لہا تو یاد دہانی سے اس کا مواعلاماتی نظام قطعاً نہیں جڑ رہا تھا۔ "اے باپے!"
 دھیندہ دھیندہ پھرتی چلی گئی۔
 دادی کی چٹلی ہوئی نگاہوں نے آخر دم تک اس کا تعاقب کیا۔

"اری لشقاہ!" پھر وہ ہوش میں آکر نہایت جل کر بولیں۔ "پشت ڈھانپنے کو کوئی چادر نہ ملی تجھے، گلے میں دیواشت کا پھندا باندھ کر چلی آئی۔"
 انہیں اس کے گلے میں لپٹے اریستی اسکارف کا کچھ مقصد سمجھ میں نہ آیا۔

"اری ہو! یہ جنید کن لڑکیوں کے چکروں میں لگا ہوا ہے؟" انہیں سخت تاؤ آ رہا تھا۔

"اوفوہ اماں! آپ تو رانی کا پیارا بیٹی ہیں۔" انہیں بیزاری ہوئی۔ "شام کے اسٹیوٹ میں اس کے ساتھ پڑھتی ہے یہ اللہ جانے کیا مشکل سام ہے۔ ایک مرتبہ پہلے بھی آئی تھی تب آٹا پور ہی تھیں۔ اس کے نوٹس جنید کے پاس ہیں وہی لینے آئی تھی۔"

"ہاں تو سوچا تھا کہ کچھ بھی لکھ آئے کو عزت دیتے ہیں۔ ارے حالہ تو سرخون کا سا بنائے۔ کم بخت باہرہ شریف بنی پھر رہی ہے۔"

"آج کل کی لڑکیاں ایسے ہی فیشن کرتی ہیں اماں۔" تاج بیگم اباے نیازی سے بولیں۔ "فلمیں دیکھ دیکھ کر بگڑی ہوئی ہیں۔"

"آہستہ آہستہ دیکھی تھیں مردار کی؟ گویا ٹیکہ لگوانے آئی ہو۔ قیص کے چاک گویا مجنوں کا چاک ہوئے۔ کم بخت کی شلوار کانیفہ نظر آتا تھا۔ اوہ پانچو؟ پنڈلیوں پر یوں چڑھے ہوئے تھے جیسے اپنے گھر کا آگن دھوتے دھوتے چلی آئی ہو۔ بالشت بھر کا رومال گلے میں کس لیا سب فرض پورے ہو گئے۔ اور ہو! انہیں یکایک خیال آیا۔ "یہ اس غریب کے بالوں کو لکلیا ہو گیا؟ ایک پی سفید ایک کالی یہ کون سی بیماری ہے؟"

"بیماری نہیں اماں جان افیشن ہے یہ بھی۔ خود رنگواتی ہیں لڑکیاں۔ کبھی سنہری کبھی نیلی۔"

"ہائیں؟" دادی کچھ دیر محو حیرت رہیں۔ "فتنہ لڑکی ہے! آنے دو جنید کو میں پوچھتی ہوں اس سے بھلا پرانی لڑکیوں سے نوٹ لینے کا اس کا کیا کام؟" چاہیں تو باپ سے مانگے، فقیر بنا پھرنا ہے۔

"نوٹ نہیں اماں۔ نوٹس! تاج بیگم نے دیا دی۔" آپ نہیں سمجھیں گی۔
 "ہاں ہو! ایک تم ہی بقراط ہو۔" انہوں نے پان کا ٹکڑا غصے سے توڑا۔ "ہم تو اب جاہل ٹھہرے باندہ آہستہ وہ زمانے لد گئے جب زمانی بیگم زوجہ صدر الدین کی عقل و فہم کی شہرت محلے بھر میں تھی۔" پان منہ میں رکھ کر ان کے غصے کو کچھ قرار آیا تھا۔



ہاتھ ماتھے پر رکھ کر گویا سیف کا اظہار کیا۔ "وہ آئے گھر ہمارے خدا کی قدرت، ہم گھر پر نہیں آتے۔"

"انہیں کچھ۔" تاج بیگم نے اسے گھورا۔ "بھئی دادی کے ساتھ ہیں، پھر وہ رات بھر روتے نظر آتے اور پھر پوچھتا ہے کیسی لڑکی ہے باک لڑکیوں کا بے تکلفی سے میرے بچوں کے متعلق پوچھنا بالکل پسند نہیں آتا۔ ان کو سمجھا دینا۔ آئندہ یہاں آنے کی غلطی نہ دہرائے۔ اپنی دادی کا کیا ہے نا؟"

"تاج بیگم پتا ہے۔ کو کونٹ کی طرح ہیں بالکل اور سے لٹکتا بندر سے بالکل نرم۔" اس پر قطعاً اثر نہ تھا۔

"چل جائے گا پتا۔" وہ جل کر کمرے سے نکل گئیں۔

"ہائے ہائے بھائی جان۔" اس نے جمشید کو بازوؤں سے پکڑ کر پورے کمرے میں لٹکا دکھا ڈالا۔ "یہ گلیاں یہ چوبارہ یہاں آنا پھر دوبارہ۔ آپ کو تو خبر ہی نہیں کیا قیامت گزر گئی مجھ پر۔"

گول گول گھومنے سے جمشید کا سر چکر اگیا اور چٹے کے پیچھے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر

لے گئے تھے۔

”باہ! آپ کہیں تو وہ سرمہ میں آپ کو لائے رہا ہوں۔ وہ روپے کی شیشی ہے۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔“

”نہیں میرے دوست۔“ اس نے مایوسی سے سر جھٹک لیا۔ ”ان آنکھوں میں اب آنسو ہی رہنے دو۔ انتظار یار کر کر کے اب یہ بے نور ہو چلی ہیں۔ اب کوئی سرمہ کچھ نہیں کر سکتا۔“

”یہ آنسو ہیں کہاں بھائی جان؟“ اس نے بغور بھائی کا چہرہ دیکھا۔ ”تالاب خشک پڑا ہے۔ کناروں پر کیچڑ جمع ہے۔ خوابشوں کے منڈک ابھی بھی پھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ نشئی کے اشتیاق سے لبالب بھری یہ آنکھیں اس قدر جلد بے نور نہیں ہوتیں۔“

شادی کے قابل لڑکیاں ہماری اوپر ہی منزل پر کبھی کبھار قیام کرتی ہیں۔“

جشید کی آنکھیں جلدی جلدی جھپکنے لگیں۔ لب بھر پھلانے لگے۔ خیرانے پر شاشت چلی آئی۔

”کفرانِ نعمت کرنے لگا تھا۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے مجھے صحیح وقت پر چونکا دیا۔“

جشید معنی خیزی سے ہنسا اٹھا۔

”لیکن میرے پیارے بھی تو سو جو کیا اچھا لگتا ہے کہ چھوٹا بھائی محبت کی رنگین کہانی کا آغاز کر ڈالے اور بڑے بھائی کے دل کا صفحہ بے رنگ و ساہ ہی رہ جائے۔ آخر تمہیں میری زندگی کے ادھورے پن کا کچھ احساس ہونا چاہیے۔ اس بے رنگ کیفیت کا کچھ تدارک کرو۔“

”ان آنکھیں میرے دل کی آواز پہچاننے کی کوئی تدبیر کوئی سبیل کرو۔“

”کہیں تو ان کے کمرے میں وہی ”لاؤڈ اسپیکر“ فٹ کروا دوں؟“ اس نے آنکھ ماری۔ ”ایسی آواز پہنچے گی آپ کے دل کی کہ ایک زمانہ سنے گا۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”یار! مجھے اظہارِ محبت

بانی ہے۔ لیکن وہ ہے کون؟ کہاں مل گئی تمہیں اور یہاں کس لیے آئی؟“ لڑکی کے متعلق دریافت کرنے کے جتن نے اسے جینے کی جھکمت پر برہم ہونے سے باز رکھا۔ وہ ٹھوڑی پر آیا ہوا چشمہ دھڑکتے لگا۔

”یام سے خستہ خان!“

”ہائیں! کوئی مشکوٰی پہ سالار معلوم ہوتی ہے۔“

وہ اتقانہ پن سے بولا۔

”انسٹیٹیوٹ میں میرے ساتھ پڑھتی ہے۔“ اس نے بھائی کے تبصرے کو چنداں اہمیت نہ دے کر ”اور“

رہی بات یہ کہ ایساں کیوں آئی تو میرا خیال ہے بھائی جان! کہ وہ گوڈے گوڈے امیر کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔ اور دیوانوں کی طرح مجھے پکار کر پھرتی ہے۔ کبھی وہ انسٹیٹیوٹ میں میرا پتا معلوم کرتی ہے۔ اور کبھی گھر تک چلی آتی ہے۔“

”چھوٹے بھائی! جشید اطمینان سے بولا۔ ”میرا خیال ہے تم پچھتا رہے ہو۔“

”وہ کیا بھائی جان! وہ دو سو روپے جو تم نے اس سے لے لیا تھا۔ تمہارا پچھا اہل قدر ہے۔ یہ بتائی سے کوئی لڑکی محض اسی لیے کر سکتی ہے۔“

”ہا ہا ہا۔ بس ہو گئے نا جیسے۔“

”ارے بھائی جان! وہ اتنی امیر ہے کہ روزانہ مجھے دو سو روپے کا لچ کر سکتی ہے۔ دو سو تو کیا ضرورت پڑنے پر میں اس کے دواکھ بھی ادھار مانگ سکتا ہوں۔“

”اچھا! جشید پر اس کی باتوں کا بالآخر اثر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں خراشت اتر آئی۔ ”لیکن چھوٹے بھائی! ذرا آئینہ دیکھ کر مجھے یہ تو بتاؤ کہ تمہیں نظر کیا آیا؟ کہیں تم نے سبزی منڈی والے چوک پر بیٹھے سامیں دل بردل مراد سے سرمہ نسخیر محبوب تو نہیں خرید لیا؟ اس روز تم مجھ سے بیس روپے ادھار بھی تو

کرنا ہے۔ خطبہ نہیں پڑھنا۔ کوئی اور ترکیب کرو۔“
 ”اچھا سوچنا پڑے گا۔“ اس نے تھوڑی کھجائی۔
 ”وہ بھائی جان یاد آیا۔ مجھے پچاس روپے چاہیے تھے۔
 جیب میں پھٹی کوڑی نہیں ہے۔ سوچتا ہوں کھل شام
 خجستہ کو کوڈ ڈرنک پلاؤں۔“

”ہاں ہاں۔“ اس نے گھبرا کر جیبیں
 ٹٹولیں۔ ”لیکن یار! دو کوڈ ڈرنکس کے لیے تو بیس
 روپے بھی کافی ہیں یہ تم پچاس روپے کیوں مانگ رہے
 ہو؟“

”بھائی جان کوئی ٹپ وغیرہ بھی تو دینی پڑ جاتی ہے۔
 آپ کو ان معاملات کا کیا پتا؟“
 ”آہ!“ اس نے جینے کی جیب ٹٹولتے ہوئے یکایک
 دل تھاما۔ ”یہ کیسی چوٹ کی ہے میسر ہے بھائی۔ اب چار
 پہرچی کو قرار نہ آئے گا۔“

”آپ پیسے دیں بھائی جان! اس قدر جذباتی ہونے
 کی ضرورت نہیں۔ وہ خبر سنائے جارہا ہوں کہ چار تو کیا
 آٹھ روپی سولہ پہر آپ مسرت سے ناچتے پھریں
 گے۔“

”اچھا! آج کتنے ہوئے وہ چار اشتیاق ہوا۔“
 ”سو فیصد!“

”آپ کو ڈانس کی اتنی جلدی ہے؟“ وہ شرارتی ہوا
 پھر اس کے بگڑتے تیور دیکھ کر جلدی سے انصافیت کی
 جولیا میں آگیا۔ ”وہ میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ ”غزل نیوز
 ایجنسی“ کے مطابق تینوں حسینا میں ہفتہ بھر کی چھٹی پر
 کل پہنچ رہی ہیں۔“

”سچ کہہ رہے ہو میرے بھائی؟“ جمشید نے جوش
 جذبات میں اس کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔
 جنید نے اس کی جیب سے جھانکنا نوٹ نکال لیا۔
 ”آپ کی قسم۔“

”میں آڈی آڈی جاواں ہوا دے نال۔“ جمشید کے
 گانے پر اڑائیں بھرتا وہ کمرے سے نکل گیا۔

”ارے شکورہ! یونہی تو مائیں اپنی بیٹیوں کو
 آٹھ کھلی کے کرتے نہیں پہناتی کھیں۔ کوئی بھیڑیو
 راز تھا نا اس کے پیچھے؟ مار پڑے آج کل کی بیٹیوں
 بیٹیوں کو۔ کلیوں والی تمہیں تو دور کی بات ہے، کلیوں
 والی شلوار بھی گئی۔ مولی مولی پنڈلیاں کے پھریں
 ہیں۔“

”پان؟“ راؤنی آچو نکلیں۔ ”ارے شکورہ! تم کچھ
 زیادہ بیان نہیں کھانے لگیں؟ پچھلے ایک گھنٹے میں
 تھکانا پتیرا بیان ہے۔ خیر!“ انہوں نے مارے بازو
 جی سے پاندان کھولا۔ ”دینے میں مجھے عار نہیں، لیکن
 یہ کم بخت کوئی کام کی چیز بھی نہیں، جو بکری کی طرح
 جگالی کے جارہی ہو۔ اچھا یہ لو۔“ انہوں نے بالکل
 نکلنے والی ایک ننھا منسا بیان اپنی ہم سخن کی نذر کیا۔
 ”ہاں تو کیا کر رہی تھیں؟“

”آپ؟ آپ وہ؟“ انہوں نے جان بوجھ کر
 منہ اٹھیں ٹیک بھری۔

”پان! یاد آیا! اس وقت کی داستان سن رہی تھی
 تمہیں۔ ارے میں یہاں بحث پر بیٹھی اس ”فنی“
 کے ذراں باتیں پوچھیں، مجال ہے جو اس نے میری
 ایک بات کا جواب دیا ہو۔ مارج کو ”انٹی“ ”انٹی“ کر کے
 چلتی بنی۔ آج کل کی چھو کر یوں کو کچھ بزرگوں کا حال
 ہے۔“

”لو کے! بھائی! پوچھا آپ نے؟“ شکورہ بی نے یک
 نکل کر ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

”ارے پوچھ لیں گے۔“ انہوں نے کبھی
 اڑائی۔ ”ہمارا لڑکے لڑکے کے ایسے نہیں شکورہ! معصوم ہے
 ہیں وہ غریب کچھ نوٹ لے آیا تھا اس سے۔ بڑی ہوئی
 ضرورت ادھر۔ کیا کہتے ہیں۔ ارے جہاں ”کمپیوٹر“
 سیکھنے جانا ہے، حالانکہ باپ نے کبھی کی نہیں کر۔

میرا قطب الدین بڑا خیال رکھتا ہے اپنے بچوں کا۔ پھر
 بھی سو ضرورتیں ہوتی ہیں بچوں کی۔ وہ ”ننھیلن“ گھر
 پہنچ گئی پیسے واپس لینے۔ انکلی پر چالیوں بھٹا رہی تھی

جیتے ہم اس کا کرتب دیکھنے کو بیٹھے ہیں۔ گردن میں
 دھال پچاسی کے چندے کی طرح گھسا ہوا کمر باندھ لیا
 کسی ہوئی تو توہارے تیلی کمر ہماری بھی تھی لیکن
 یہاں ہے جو کسی کو زندگی بھر خبر ہوئی ہو۔ سوائے
 ہمارے ابا کے۔ ان کی تو بیٹھن میں سما جاتی تھی میری
 کمر۔ میرے ابا میاں؟ شکورہ بی کو غشی محسوس
 ہوئی۔

”ارے ہمارے شرمناک! صدر الدین جنت
 رکابی؟“ داوی نے چنگلی پر سے چونا چاٹا۔
 ”چھالی بی جان میں اب چلوں۔ گھر پر لڑکیاں اکیلی
 ہیں۔“

شکورہ بی داستان کی بے رحمی کو اکتا کر اٹھ
 کھڑی ہوئیں۔ اب بھلا لڑکی کا محض جلیہ کہاں تک
 سنے جائیں۔ داوی اپنے پوتے کو تو صاف بچا کر لے گئی
 تھیں۔ داستان میں بچی مفقود تھی۔

”چلتی ہو؟ اچھا جاؤ پھر آنا خیر المے ایک تو یہ پان
 بست منگے ہو گئے ہیں۔ جانو گی کو جنال ہی لگا لیا ہم نے
 کس کام کا مواشوں جان کو بھی لیا ہے۔“
 شکورہ بی ٹانگ بھوں چڑھا کر ان کی نصیحت ہوئیں۔
 داوی پانڈان کے نچلے حصے سے ریزگاری نکال کر گئے
 لگی تھیں۔

”السی برکولی شوخ سی دھن بچاتا وہ بے حد خوشگوار
 موڈ میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ تخت پر براجمان داوی کو
 ہشیار باش پا کر اس کی شوخی لہوا ہو گئی۔ کتابوں کو
 سنبھالنے میں مشغول ہو کر وہ ان کے قریب سے
 گزرنے لگا۔“

”ارے او میاں پھیلے۔“ پاپا دار آواز پر وہ گڑبڑا کر
 رک گیا۔

”وہ داوی جان۔ اوسے السلام علیکم۔“
 ”و علیکم السلام۔ کہاں بچتے بچاتے نکل رہے ہو؟“

یہاں آکر نہ خود کھڑی۔

جنید کو جان بچانے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔
 ناچار گردن کھجا آدھ ان کے پاس جا بیٹھا۔

”ای۔ کھانا۔ بھوک لگی ہے۔“ اس نے داوی
 جان کا دھیان بنانے کی کوشش کی۔

اس کی آواز سن کر جمشید بھی چلا آیا۔ وہ بھی تخت پر
 چڑھ گیا۔

”پڑھائی اچھی کرتے ہو؟“ انہوں نے پوتے کو
 مشکوک نگاہوں سے گھورا۔

”میلیری پیاری داوی!“ وہ پھرتی سے ان کے پاس

رضیہ جمیل کے شاہکار افسانے

بدریا بھٹس کمی اس پار

شائع ہو گیا ہے

ایک تصویر کتاب آپ

ایہ سنو کے لئے خوبصورت تحفہ

قیمت 150 روپے

اس کے علاوہ 2 مکمل ناولوں کے

ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں

اک گھروندہ برف کا 300 روپے

کا گہر وریا بادل بوند 300 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

737 اردو بازار کراچی

آگیا۔ ”صبح و شام“ دن رات کتابیں کتابیں اور کتابیں۔ صبح کرنا شام کالانا ہے جوئے شیر کا۔“
 ”ہوں۔“ انہوں نے جیسے کئے ”قلب سے اسے دیکھا۔“ وہ تازمین کل تمہارا پوچھتی پھرتی تھی۔ وہ کون ہے؟“ جنید نے کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کرتے ہوئے کان کھجایا۔

”یہ پیری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟“ اس نے جنید سے پوچھا۔ ”غمرہ و غشوہ ادا کیا ہے؟“
 ”ناس پئے! ٹھیک ٹھیک ہوں۔“ بالآخر اسے ایک ادھمو کا ملا۔ ”کیوں راہ و رسم بڑھائی ہے تو نے اس سے ہنٹوں مانگنے کو کوئی مرد بچہ نہیں ملا؟ لڑکی کے سامنے فقیر کیوں بناتو؟“

”بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب!“ اس نے آہ بھر کر گمراہلائی۔ ”تمہارے اہل کرم دیکھتے ہیں۔ لیکن پیاری دادی! نواس تو اس نے مجھ سے مانگے ہیں۔ میری رات رات بھر کی کیا صحتیں؟ کس نے آپ کو اغلط فیذ کیا ہے؟“

”تیری اماں ہی کہہ رہی تھی کہ تو نے اس سے ادھار رقم لی ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے فرشتوں کی لکھے برناحق۔ ”پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کی لکھے برناحق۔“
 اس کی آیتاں نکھیں خیریت سے پھیل گئیں۔ ”آوی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا!“

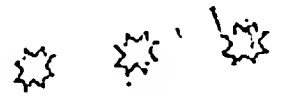
”اچھا! اب آئے گی تو میں خود لوچھوں گی لاکھ سے۔“
 ”انشاء اللہ کہیں کی۔ کہہ گئی ہے پھر آئے گا۔“
 ”کہ خوشی اسے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا۔“ اس نے سر آہ بھری۔

”اور مروود! تجھے شرم نہ آئی ایسی بے لباک لڑکی سے دوستانہ کرتے!“ اسے پھر ایک دو ہنصڑ سے نوازا گیا۔ ”گلے میں بالشت بھر کا روٹان پاندھ آئی تھی بے شرم۔“

”ہائے!“ جنید نے آنکھیں گول کیں۔ ”اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب!“
 ”مردار! کیا بکے جا رہا ہے؟“ کوئی غضب ناک ہوئیں۔

”کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔“

جمنید حیرانی سے آنکھیں پھاڑے بھائی کی سر دیکھ رہا تھا۔



”یار جنید!“ وہ خوشامدی انداز میں اس کے پاس بیٹھا۔ ”یار! یہ اتنے اچھے اچھے شعر کہاں سے یاد کیے؟“

”ہائے بھائی جان!“ اس نے سر کھجایا۔ ”میں کہاں اور یہ وہاں کہاں۔ نازنیوں کو متاثر کرنا بھی کوئی آسان کام آئے؟ غالب کا جگر خونم خون ہو گیا۔ ذرا دیوان اشعار دیکھیے۔ ہفتہ بھر ایسے سر کھیا رہا ہوں تب کہیں جا کر ایک دو غزلیں ملتی ہیں۔“

”تم نے تو رٹ لیں یار! میرا کیا ہو گا؟“ وہ مایوس ہوئے ہوئے تو جڑیا گھر کے شیر کا حلیہ یاد نہیں۔ آنکھیں بند کر کے سوچوں تو بلی ذہن میں آجاتی ہے۔ میں ایسے شعر کہاں یاد رکھ سکتا ہوں؟

”تو تو آپ کو یاد کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“ اس نے براہ منہ بنایا۔
 ”ارے واہ۔ خود تو غالب کا دیوان یاد کر رہے ہو اور مجھ سے پوچھتے ہو کیا ضرورت ہے! تم اس خستہ خان غالب کے شعر سناؤ اور میں اپنی شمو کو کچھ نہ سناؤں۔“

”آپ کی شمو؟“ وہ اچھا اچھا شمشاد بیگم کا ذکر کر رہے ہیں آپ آپ اسے موسم کا حال سنائیں بھائی جان! لی لڑکی واپس لے روزتاتے ہیں؟“

”میرے پچاس روپے فوراً واپس کرو۔“ جمنید طیش آگیا۔ ”اور اس سے پہلے والے بیس روپے بھی ابھی نکالو۔“

”اوہو ہو۔۔۔ بھائی جان! میرے پیارے بھائی! تو خفا ہو گئے۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ اچھا تو آ رہا شمو کو شعر و شاعری سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا مشکل ہے؟ میں آپ کو ایک سادہ صدف پر آدس اچھے اچھے اشعار لکھے دیتا ہوں۔ سنا ڈالیں۔“

اس نے ایک خاص ادا سے بال جھٹک کر انگلیاں
ماٹھے سے لگائیں۔
”لیکن یار! سناؤں کسے؟ تمہاری وہ خجستہ خان تو
روز انسٹیٹیوٹ میں ملتی ہے تمہیں۔ شمو تو کبھی
پیڑھیوں پر بھی نہیں آتی۔“ وہ ہزاری سے بولا۔

”اچھا تو یہ بات ہے؟“ اس نے کچھ دیر غور کیا۔ ”تو
بھائی اجاں! آپ تو یوں بھی سولہویں صدی کے رومیو
ہیں۔ اظہارِ محبت کے لیے طریقہ بھی فرسودہ اختیار
لیجئے۔ آپ کی عقل و فراست کا رہ بھی رہ جائے گا“
اور حسد کے طمانچے کا خوف بھی جاتا رہے گا۔“

”اچھا!“ حسد اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کی
گردن میں بازو جھانک کیا۔ ”تو جلدی کہو میرے داتا
دوست مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”ایک عدد خط تحریر کیجئے۔ اس میں اپنی شکایت
بائے رنگیں بیان کیجئے، تغافل باپے بھائی کا کلمہ کیجئے دل
گم گشتہ کا سراغ مانگیے۔“ لیکن بات کی قصیدہ خوانی کیجئے۔“
حسد نے اپنا بازو اس کی گردن سے نکال لیا اور
اسے بڑی طرح گھورنے لگا۔

”یار جنید! مجھے چار خط لکھنے کی ضرورت نہیں
لکھنا یار! کوئی آسان بات بتا کر دینا۔“
”آسان بات؟“ حسد نے کان کھجایا۔ ”آئی لو یو
سے آسان بات کوئی نہیں بھائی جان! سیدھا سیدھا
لکھ بھیجیں۔“

”نہیں یار تو سمجھ نہیں رہا۔ کوئی پھڑکیا کر کر کوئی
ایسی مٹا کر کن بات کہ بس تڑپ اٹھے ظالم۔“
”مرغ کی سالم کیجی (شج) ہیں۔“ وہ طنزاً بولا۔
”اے جگر کے نام سے۔“

”میں ایسے ہانگ لوں گا۔“ اس نے دھمکی دی۔
”میں مزید پیسے لوں گا“ وہ بھی اکڑا۔ ”سوروپے
میں ایک عدد خط بمولیس منظور ہے؟“
”سوروپے؟“ حسد پریشان ہو گیا۔ ”یار! یہ تو بہت
ہیں۔ پتا نہیں کتنے خطوں کی ضرورت پڑے یوں کرو سو
روپے میں چار خط۔“
”نہیں خالی خالی نشی ہوں کیا۔“ وہ بے رخی سے بولا

اور کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔
”اچھا چلو دو خط۔ اب تو مان جاؤ۔“
”مہوں!“ اس نے خرے سے سر ہلایا۔
حسد نے خوشی سے کھل کر اس کا گال چوم لیا۔



”آئے لمبوسم رنگیلے سہانے جیانا میں مانے۔ تو
چھٹی لے کر آجا بلا۔“ غزل بے حد موڈ میں گنگناتی
ہوئی کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

باہر کچن میں اپنے تخت پر براجمان پنج سورہ پڑھتی
دادی کے کان کھڑپے ہو گئے۔ انہوں نے چشتے کے
اوپر سے عقابی نگاہیں بنا کر کچن کے دروازے کو کچھ دیر
گھور کر گانا بند ہونے کا انتظار کیا، لیکن اندر اپنے کام
میں منہمک غزل ان کے اندرونی تلاطم سے بے نیاز و
بے خبر تھی۔ وہ بدستور گنگناتی رہی۔

”ہوں ہوں۔“ ہوں ہوں۔“ بالآخر دادی جان
نے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا پنج سورہ کے دوران
گفتگو کرنا ان کے نزدیک آداب کے خلاف بات
تھی۔

”کیس پھول کو بھنورا چوم گیا۔“
دادی جان کے چہرے کے تاثرات غضب ناک
ہوئے۔ ان کا زور زوراً بے ہوشی موقوف ہوا۔

”میرا دل مستی میں جھوم گیا۔ کوئی میری خوشی کو نہ
جانتے۔“

دادی جان نہایت غصے میں پنج سورہ جزدان میں لیٹنے
لگیں۔

”مردار کہیں کی۔ ذرا ادھر آتو۔“ انہوں نے
کڑک دار آواز میں کہا۔

غزل کونل کے شور میں ان کی بات سمجھ میں نہ
آئی۔ وہ اب ساس پین مانجھنے میں مشغول تھی۔

”بڑے ازمائشوں سے رکھا ہے بلم تیری قسم۔ پیار کی
دنیا میں یہ سہلا قدم۔“

اس کی کمر پر ایک زوردار دھنوکا پڑا۔ وہ اچانک
افتادے لے ہو کھلا کر رہ گئی۔

”مردود نکلیں گی۔ کانوں میں تیل نہیں ڈالا جاتا تبھی
سے؟ سہری بنی کھڑی ہے۔۔۔ دے گانے پہ گانا۔ دے
گانے۔ گانا۔ میرا اللہ رسول کا نام لینا نہ بھر کر ڈالا
تو نہ تاج تاج۔“

وہ بے حد غصہ ہوا کہ ہوری تھیں۔ اندر آتی تاج
بیگم نے بھی غزل کو گھور کر دیکھا۔
”یہ کیا ہر وقت گانے گاتی رہتی ہو غزل؟ زبان کو دو
گھڑی قرار نہیں ہے؟“

”اری تاج! گانا بھی وہ گاتی ہے جس میں گھوم
پھر کر اسی مردود کا ذکر ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں خدا خدا
کر کے تو وہ کیا ہے گھر سے۔ شیطان تو ہے پورا انتہا ذکر
ہو گا تو پھر چلا آئے گا۔“

تاج بیگم اور غزل کے چہرے پر کچھ نہ سمجھ میں
آئے۔ والے تاثرات پیدا ہوئے تھے۔
”میں تمہیں کا ذکر کروں گی یا وہی؟ وہ لڑ سہلائے
ہوئے رونی آواز میں پوچھیں تو آپ کی پسند کا گانا
۱۱۱ گارہی تھی۔ آپ سے ہی سیکھا تھا میں نے۔“

”اوہ! ہاں! میں ہی گنگناتی تھی۔“ انہوں نے اقرار
کیا۔ ”لیکن جب یہ مردود کا ذکر کرتا ہے تو
میں نے اپنی پسندیلیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔“

”کیوں؟ وہ عجیبے چارہ کیا کہتا ہے؟ تاج بیگم نے
ناک بھوں چڑھائی۔
”اری ہر گانے میں تو بالم بالم کہتا ہے۔ زمین میں
۱۱۱ خبیث کی ہستی آجاتی ہے۔“

غزل اپنی اکڑ کا دھوکا بھول بھال زور زور سے ہنسنے
لگی۔ تاج بیگم بھی مسکرائے۔
”خدا خدا کر کے تو وہ چھٹی پر گیا ہے اس کی کچھ
۱۱۱ دیر کو گلو خلاصی ہوئی ہے نہ گایا کرو بالم بالم والے
گانے۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن سے نکلیں۔
”کیا ذکر اذکار کرے کوئی ایسے گھر میں۔“
”گورے گورے گورے گورے چھوڑے۔۔۔ کبھی
۱۱۱ امیری گلی آیا کرو۔“ غزل شرارت سے گنگناتے ہوئے
اندر کو بھاگی۔ وادی نے جل کر جوتی اٹھانے کو ہاتھ

۱۱۱

۱۱۱

۱۱۱

برہمایات تک۔ بھاگ چکی تھی۔

وادی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا باندھان کھولا۔

کی سوکھی نکھیا پتھری سے رگڑنے لگیں۔
”اوسے میں کیا۔ چاچی جی۔ ایسے بوبہ (دروازہ)
کھولیں۔“ (میں نے کہا) چاچی جی یہ دروازہ کھول
دیں۔)

وادی جان نے حیرت اور خفگی سے اوہرا دھرا دھرا
گویا آواز کا منبذ اچھونڈنے کی کوشش کی۔
”او جی۔۔۔ استھتے استھتے میں استھتے آئے۔“ (میں
اوہر ہوں۔)

وادی نے ہاتھ کا چھتجا بنا کر اوپر کی سمت رکھا۔
خورشید علی صاحب کے بڑے بھائی عرف چاچی اپنے
روایتی لباس میں ملبوس وہاں کھڑے ہاتھ ہلا رہے تھے
”کیا ہے؟“ وادی برسیں۔ ”کیوں حلق پھاڑ رہا
ہے؟“

”او چاچی جی میں بڑبڑاتا ہوں۔ بوبہ (دروازہ) بند ہے
کھولیں۔“ (چاچی جی میں بڑبڑاتا ہوں باہر سے دروازہ
بند ہے۔ کھولیں دیں۔)

”او جی! وادی نے ناک پر انگلی جمائی۔ ”کون سی
بوا کہاں بند ہے بھالی؟“
”او چاچی جی۔ ایسے بوبہ (دروازہ) انہوں نے بے بسی سے
کہا۔

”او جی! وادی نے ناک پر انگلی جمائی۔ ”کون ایک
بات بولیں۔ کبھی چاچی کہتا ہے کبھی بوا کہتا ہے۔ ارے
بھائی میں اتنی بڑھی نہیں۔ تم سے دو چار برس ہی آگے
ہوں گی۔ لو بتاؤ بھلا۔ سفید بال ہیں بڑھے کے۔ نکال
بن اڑا ہے۔“

”اونٹنیں بنی نہیں میں آکھیاں بوا بند ہے۔“
”ارے کون سی بوا بند ہے؟“ وہ جھٹلا گئیں۔
”اندر سے نہایت تیزی سے تاج بیگم برآمد ہوئیں۔
”رہنے والیں آپ۔“ انہوں نے ساس کو بد مزہ
سے کہا۔ ”وہ بے چارے اوپر بند ہیں۔ کام والی ہاں باہر
ہیں۔ وروازے کی گنڈی لگا گئی ہے۔ دوسری جانب
نور بانو آواز لیں رہے رہی ہیں۔ یہاں سے بھالی صاحب

۱۱۱

۱۱۱

۱۱۱

چلا رہے ہیں۔ آپ کو تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔
میں کھول کر آتی ہوں ان کی کنڈی۔“

۲۰۔ سب فنکار ہیں یہاں۔“ داؤدی ہلر جھٹک کر پان پر اطمینان سے کتھے کا کوٹ کرنے لگیں۔
”اب میں کیا جانوں؟ سیلا ہی بات نہیں کرتا۔ بوا بوا کیے جا رہا ہے ننھا میاں۔ بھائی سچ سے بول باہر سے گنڈا لڑا ہے کھول دو ہم سمجھیں بھی بازیک ڈھوتی لیٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ حواس تو ویسے ہی خبط ہونے لگتے ہیں نگاہ پڑتے ہی اللہ اعفرت کرے جنت مکانی صدر الدین صاحب کی کیے نفیس آدمی تھے۔“

۲۱۔

”کیا کرتی ہو نور بانو؟“ داؤدی جو بڑی دیر سے رینگ میں اپنے دکھائی دیتی نور بانو کی سرگرمیوں کو بھانسنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بالآخر نہ سکیں۔
”اتنا اندازہ تو انہیں ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم کام سرانجام دے رہی تھیں۔ ایک مخلصو صبر قسم کی خوشبو بھی ان کی ٹاک کو گند گدا کر چا چکی تھی۔ سو اب وہ بے تاب ہو کر انہیں پکار رہی تھیں۔“
نور بانو ان کی پکار پر خوش آؤں رینگ چلی

۲۲۔ ”اماں جی! اناں دا اچار بوندی آں۔ نالے مرچاں تے لیموں وی آں۔“ (اماں جی آپ کا اچار ڈال رہی ہوں اسیاتھ میں مرچیں اور لیموں بھی ہیں)۔
”اچھا اچھا میں بھی کہوں کھٹی کھٹی خوشبو آرہی ہے۔ کیسے ڈالتی ہو کوئی خاص ترکیب ہے کیا؟“

۲۳۔ ”اماں جی! تسی آجاؤ نا۔“ (انہوں نے خوش دلی سے کہا۔)
”اچھا!“ داؤدی جاننے لے لے بھر توقف کیا۔ ”چلو تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو آجاتی ہوں۔ ویسے سیڑھیاں چڑھنا مشکل ہے میرے لیے۔“

”آہو جی۔ پورا ہیاں (سیڑھیاں) داتے مسئلہ ہے!“ (ہاں جی۔ سیڑھیوں کا تو مسئلہ ہے۔)
”خیر! داؤدی برا مان گئیں۔“ اتنی بوڑھی ابھی نہیں

ہوں میں۔ اللہ رکھے ہاتھ پیروں سے سلامت ہوں کسی کی محتاج نہیں۔“

”نہ جی میں کیا پوڑھیاں وامسلہ اے!“
”کیا بوڑھی بوڑھی کیے جاتی ہو؟“ داؤدی جھٹلا گئیں۔ ”خود بڑی نوجوان ہے کم بخت۔“
آگے وہ منہ میں بڑبڑاتی گئیں۔ وہ ان کی سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھیں جو ان کے کھن میں اترتی تھیں ان کو آتا دیکھ کر نور بانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

۲۴۔

”تاج ذرا اڈھیر آؤ بھی۔“ قطب الدین صاحب نے کمرے سے آواز دی تھی۔

تاج بیگم دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں داخل ہوئیں۔

۲۵۔ ”اگرے بھئی پور اوراوتے پھٹا جاتا ہے۔ سردرد کی گولی لا کرو۔ ایک کپ چائے بنا دو اسیاتھ میں۔“

”جی اچھا!“ وہ فکر مندی سے بولیں۔ ”گولیاں تو ختم ہو گئی ہیں۔ میں جمشید سے منگواتی ہوں۔ تب تک چائے بھی بن جائے گی۔“

”وہ تمہارا لاڈلا لڑکے کا رات کے کسی ڈھنک کے بند لے کو بھیجو!“ وہ کراے۔

”لیجئے۔ اب اٹنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔ آپ کو تو ہمیشہ اپنی اولاد میں کیرے دکھائی دیتے ہیں۔“

۲۶۔ ”خفا ہو رہی ہیں۔“ میں ابھی لے آتی ہوں گولی اور چائے۔“

وہ مڑ کر کمرے سے نکلی تھیں۔

”جمشید۔ او جمشید۔“

”جی امی۔“ وہ عینک درست کرتا چلا آیا۔

”تمہارے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سردرد سے بے حال ہو رہے ہیں۔ دوڑ کر گولیوں کا پتہ لے آؤ میڈیکل اسٹور سے۔ میں تب تک چائے بناتی ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

”جلدی آنا۔ دیر نہ کرنا۔“

”بھی گیا، ابھی آیا۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب

بڑھ گیا۔

گیت سے باہر نکلتے ہی وہ پتھر کا بت بن گیا۔
باہر کھڑی ایکسی میں سے تین عدد حسینا میں برآمد
ہو رہی تھیں۔ جمشید کا الپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے
رہ گیا۔ اس کے دل میں سب سے پہلا خیال یہی آیا
کہ دوڑ کر جائے اور جنید کو بلا لائے پھر اس نے اپنا
خیال خود ہی رد کر دیا۔ جنید کی موجودگی میں اسے ہمیشہ
صفر مار کس ملتے تھے۔

ارشاد کی نگاہ اس کے کھلے ہوئے منہ اور پھٹی ہوئی
آنکھوں پر پڑی۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس نے
نیکسی والے کو پیسے دیتی شمشاد سے کچھ کہا۔
تینوں مڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ بے طرح شرما

گیا۔ ”جمشید صاحب! ابی جھٹتے ہیں۔ ذرا ادھر

آئیں۔“ غالباً وہ شمشاد ہی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔
جمشید کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے
وائیں دیکھا پھر اس پھر ہونق پن سے آسمان کو دیکھا۔
وہ تینوں قہقہہ مار مار کر ہنسنے لگیں۔

”ہم یہاں ہیں!“ وہ کورس میں ہو گئیں۔
وہ پھر شرمایا، پھر جھکا، اپنا چشمہ اتار کر پھر سے پہنا۔ اور
پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ان تک پہنچا۔
”کیسے ہیں جناب؟“ بے تلافی سے پوچھا گیا۔

”جی میں... جی میں... جی میں...“ خوشی سے آواز
اس کے گلے میں اس طرح پھنسی کہ پورا جملہ باہر نہ
آسکا۔ قہقہہ پھر لگا۔

”اچھا... اچھا... ٹھیک ہے، ہم اب بچھل گئے۔ آپ
بہت اچھے ہیں!“ بڑی شوخی سے بولی۔

جمشید نے آنکھیں پٹیٹا پٹیٹا میں اور اثبات میں سر
ہلایا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔
”ایک کام ہے۔ کریں گے؟“ انداز دلبری سے
پوچھا گیا۔

سر پھر فافٹ اثبات میں ہلایا۔
”یہ ہمارا سامان اوپر تک لے چلیں۔ سچی سفر سے

اتنے تھک گئے ہیں۔ ہلا تک نہیں جاتا۔“

”کیوں نہیں چکیوں نہیں۔ میں سب لے جاؤں گا۔“

اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے اٹیچی کیس
اٹھالے۔ شمشاد نے جلدی سے سفری کوارٹر اس کی
گردن میں لٹکا دیا۔ ارشاد نے ہینڈ بیگ اس سے رانیں
کاند لٹے پر رکھ دیا۔

”یہ کمبل؟“ دلشاد نے پوچھا۔

”ان کے سر پر رکھ دو۔ کیوں جمشید صاحب؟“

”بالکل بالکل۔“ اس کی پھنسی چھنسی آواز آئی۔

”ہاں ہاں جوان! گٹرے آوی ہیں۔ کوئی اتنے سے

سامان سے ان کی بیٹی تھوڑا ہی ٹوٹنے والی۔“ چھوٹی

ارشاد نے ٹکڑا لگایا۔

”جوان! اور“ گٹرے“ کے الفاظ نے اس کی لچکتی

کمر کو کافی سہارا دیا۔ لیکن چشمہ حسب معمول برک

کرناک کی پھنگ پر جا پہنچا۔

”مہم میرا چشمہ۔“

”اتار لے!“

”مہم! میں دیکھوں گا کیسے؟“ اس نے پھولی ہوئی

سانسوں میں پوچھا۔

”ہم لیے چلتے ہیں جناب! یہ دیکھیں آپ کا بازو

یکڑا گیا۔“

”ہی ہی ہی...“ اس کی ہنسی نکلی۔ ”مہم۔ مجھے گد

گدی ہوتی ہے۔“

”ہمیں بھی تو ہو رہی ہے، ہم کوئی ہنس رہے ہیں؟“

یہ دلشاد بھی جس نے مسکراہٹ مشکلوں سے ضبط کی

ہوئی تھی۔

دونوں جانب سے اس کے بازو تھام لیے گئے تھے۔

بوجھ کا سارا احساس ہوا ہو گیا تھا۔ شرابی شرابی

مسکراہٹ کے ساتھ کمر لپکا مٹکا کر اس نے میڑھیاں

طے کیں۔

”امی جی! اسیں آگئے۔“ ارشاد نے آواز لگائی۔

”ہائے ہائے!“ میں صدقے میں واری۔ میری

کڑیاں چٹے ویلے پہنچی آج۔

نور بانو خوشی سے بے حال ہو کر آگے بڑھیں، پھر
شیشہ ٹک کر رک گئیں۔ ”ہائے وے رہا ایس بے
چارے والی خالی کیتا اے؟“ وہ حیران نظروں سے
جہنم کو دیکھنے لگیں۔ جاکے لڑکیاں سیاری وادی جان کو
سانے بیٹھا دیکھ کر سب شوخی بھول گئیں۔ وہ شعلہ بار
نگاہوں سے اپنے پوتے کا حال دیکھ رہی تھیں۔
شمشاد، دلشاد اور ارشاد نے فٹاٹ اپنا اپنا سامان

تھاما۔

”میرا چشمہ۔“ اس کے لبوں پر بڑا ہتھوڑا مسکراہٹ

تھی۔

شمشاد نے جلدی لپیٹے ہاتھ میں پکڑا چشمہ اس کی
آنکھوں پر لگا دیا۔ سب سے پہلے جو چیز اسے نظر آئی وہ
وادی جان تھیں۔ جہنم کو اپنی بصارت پر ایشیہ گزرا۔
اس نے جلدی اپنے چشمہ اتار کر صاف کیا اور پھر سے
لگایا۔ منظر حسب سابق اٹھاپا۔

”دوسرے وادی سے آئے۔ آپ یہاں آتیا کر رہی ہیں۔
میں تو ان کا لٹھیا ہاں آئے۔ وہ میں جو ان نگڑا آدمی نیچے گھڑا
تھا۔ آپ بوڑھی خان بھان بکوں میں بیٹھی ہیں؟“
”کوئی نکال گردن سے!“ وہ گڑبگڑ وار آواز میں
بولیں۔ ”اور چل بیٹھے۔“

”کم بختی مارے ناس بیٹے مروار شرم میں آئی تجھے؟“ جہنم نے
وادی غضب لپٹا کر ہو رہی تھیں۔
”وہ وادی میں تو ان کی ہر قسم۔“ وہ منمنایا۔
”ارے قلی ہے تو مزدور ہے کیا ہے؟“
”وہ وادی میں تو۔“

”گدھا ہے گدھا۔“ قطب الدین صاحب نے
نکڑا لگایا۔ ”پرائیوں کا بوجھ ڈھونڈا ہے۔ باب وادی کے
لیے بے حال ہوتا رہے اس کی بلا سے۔“
”میں وادی لینے ہی جا رہا تھا ابو جی! رستے میں
دوسرے۔“

”ایسی بلا میں ہیں کم بختیں۔ میرے بچے کو خیر

بناؤ والا۔ ارے تاج بالکل قلی لگ رہا تھا۔ قسم لے لو۔
پہلے تو میں پہچانی نہیں۔ چشمہ تک نہیں تھا چہرے پر
سینچو لگ رہا تھا۔“

غزل منہ دبا کر ہنس دی۔ اس کے ایک مٹکا پڑا۔
”میسمنی۔ ہنس رہی ہے بڑا بھائی ہے تیرا۔“
”وادی آپ ہی تو مذاق بنا رہی ہیں۔“ وہ برا سامنے
بنا کر کندھا سہلانے لگی۔

”میں تو تیرے باوا کا بھی مذاق بنا سکتی ہوں۔ وادی
ہوں تیری۔ چل اٹھ، جا کر نہا۔ بال کیسے چیکٹ
ہو رہے ہیں اب اور سن لڑکے۔“
انہوں نے جہنم کو گھوڑا۔

”اگر آئندہ میں نے تجھے ان کا بوجھ ڈھونڈتے دیکھا تو
مٹکے میں رسی ڈال کر ان کے صحن میں باندھ آؤں گی۔“
سمجھا؟

”ان کے صحن میں؟“ اس کی باچھیں اس تصور
سے ہی کھل گئیں۔

پھر جلدی سے اس نے باپ کی طرف دیکھ کر گردن
جھکا لی۔

UrduPhoto.com

عشق و مزدوری عشرت گہہ خیر کیا خوب!
ہم کو تسلیم آنگوہ جانی فرہاد نہیں
جنید نے ”دیوان غالب“ بند کرتے ہوئے کہا۔
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ بھالی جان! کہ فرہاد کا کام عشق کرنا
ہے۔ مزدوری نہیں۔ عشق اور عشرت گاہ کی مزدوری
دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اب آپ کبھی شمو کی نگاہ
میں عاشق نہیں بن سکتے۔“

”یوں نہ کہو میرے بھائی۔“ وہ دل گداز انداز میں
بولی۔ ”تو نے میں فرہاد کی طرح ہی چشمہ مار کر اپنا سر پھوڑ
لوں گا۔“

”چشمہ نہیں تیشہ!“ اس نے تصحیح کی۔
”ہاں ہاں وہی وہ ہوتا کیا ہے؟ کہاں سے ملتا ہے؟“

”اسے تو اپنے ابا جان سے درختے میں مالتھایا خسرو نے ازراہ منایت نیا گور، طاکیا بومگ۔ آپ کو — کچھ خریدنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جذبات اور گزرتہ واقعات کو باریک بینی سے دیکھتے ہوئے پیش گوئی کی جاسکتی ہے کہ یہ کام ازخود ہونے والا ہے۔“

”اچھا!“ اس نے جنید کی بات قطعاً نہ سنی اور دپڑے سے بولا۔ ”وہ کس طرح میرے بھائی! بھائی“

”دیکھتے جائے!“

”اچھا وہ خط لکھا بنا؟“

”آپ کے پاس ابھی خط خریدنے لکھنے لیے رقم کہاں ہے۔ فی خط پچاس روپے کی بات طے ہوئی تھی۔“

”تو یار! ادھار کرلو۔“

”اچھا! ادھار سے میں آپ کی محبت کی پینکٹ لکھنے لگتا ہوں۔“

”سہلے ہی کاشد دل لگا۔“

”اتنے سنگ دل بہت جلد میرے بھائی!“ اس نے ٹوڑ میں رقت اور سوز پیدا کیا۔ ”وہ خط لکھا میں چند دن کی رخصت لے کر آئی ہوں۔“

”ہائیں؟ اللہ بڑا ہے!“

”میں نہیں اپنے اپنے کاجوں سے نہیں پھر لوٹنا ہے۔ کچھ دنوں میں اوپری منزل پھر میرے دل کی طرح خالی ہو جائے گی۔“

”آپ کی ”اوپری منزل“؟“

”اوپری منزل؟“

”وہ تو پہلے ہی خالی ہے بھائی جان!“

آپ کو کیا مغالطہ ہوا؟

وہ بھنا کر رہ گیا۔

”تم خود کو غالب پارٹ ٹو تو نہیں سمجھتے لگے؟ بہت اترار ہے ہو!“

”میں کسی شاہ کا املا صاحب نہیں ہوں بھائی جان!“ اس نے سر آہ بھری۔ ”مجھے خان کی دوستی نے میرا دیوالیہ نکال دیا ہے۔ دن رات ایک کر کے نوٹس بناتا ہوں۔ وہ حسینہ ایک اداسے دلبری سے مسکرا کر بغل سے فائل نکال لیتی ہے۔“

”حسینہ ہو کر بغل میں فائل رکھتی ہے؟ خنجر

نہیں؟“ جمشید نے حیرت سے چشمہ درست کیا۔

”میں اپنی بغل کی بات کر رہا تھا بھائی جان! فائل ہے۔“

چونکہ میری اہوئی ہے اس لیے میری ہی بغل میں برقی ہے۔“

”تو وہ کیوں نکالتی ہے؟“

”تاکہ اسے بنے بنائے نوٹس مل سکیں۔ جو چیز اس کے پاس نہیں لکھی ہے وہ اس کو استعمال کرنے کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے سر آہ بھری۔

”اس کے پاس کیا نہیں ہے؟“

”جو آپ کے پاس بھی نہیں ہے اسے بنے بنائے نوٹس درکار ہیں۔ آپ کو لکھے لکھائے خطوط کی طلب ہے۔“

”اور تمہیں کیا درکار ہے؟“ جمشید نے اسے

گھورا۔

”آہ!“ اس نے سر آہ بھری۔

”یک جاتے ہیں ہم آپ کے متاعِ شغلی کے ساتھ لیکن عیار طبع خریدار کو دیکھ کر!

جمشید نے غصے سے سر جھٹکا۔

”غصہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے دیوان غالب کو گھورا۔ ”کوئی آسان سا شاعر ہونڈے تیار!“

”مسلم دادی!“

”دادی! اپنے تخت پر گاؤ تکیے کے سارے نیم دراز تھیں۔ بازو آنکھوں پر رکھے وہ سستی سے لیٹی اونگھ رہی تھیں۔ آواز پر اچھل ہی پڑیں۔ سامنے بلم کھڑا مسکرا رہا تھا۔“

”بہت تیرے کی مردار!“ وہ اٹھ بیٹھیں۔ ”چلا آیا تو

لبوترامنہ لے کر۔“

”ہی ہی ہی!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب ڈر آیا کہ ہمیں دن رات۔“ وہ چٹکھی اٹھا کر

بیزاری سے جھلنے لگیں۔

”میں پنکھا جھل دوں دادی۔“ وہ خوشامد سے بولا۔

”نہ! المعاف رکھ ایک مرتبہ میرے کان پر ماری

70

تھی۔ کبھی تو نہ تو کہاں مل گا ہے کام میں۔“
 ”جی ہاں، ادی؟“
 ”اوپر تو گاما، باہارا۔ تجھے کوئی پوچھنے والا ہے؟“
 چل بیٹھ اور ذرا اباب بیروں کو۔ ”دادی اس کی چالپوسی

سے کچھ راضی ہوئیں۔“
 وہ جھٹ سخت پر بیٹھ گیا۔ اُن کی ٹانگیں اٹھا کر اپنی
 گواہ میں جو رکھیں دادی پیچھے کواٹ گئیں۔
 ”ہی ہی ہی دادی تم گئیں۔“ وہ گھبرایا مکر اسے ہنسی

بھی آگئی۔
 گاؤں کے پرانی ہوئی دادی چلا میں اُٹھا
 ”اُمم! جنت اللہ کی مار خبیث اٹھا مجھے سیدھا کر۔“
 میں تجھے سیدھا کر دوں گا۔ ”یالم نے لپک جھپک کر انہیں
 سہارا دے کر پھر سے بٹھایا۔

”چھٹری پکڑامیری!“
 اس نے جلدی سے ان کی چھٹری اٹھا کر انہیں
 تھمائی۔
 ”مرد اسے پال پیٹے!“ پے در پے کئی وار انہوں
 نے اُن کی پسلیوں پر کیے۔

”ہائے اللہ! وہ کیا دادی سے لگتی ہے!“ وہ ہر دوار
 پر اچھلا۔
 ”ارے! تو تو بیک دل ہمارے سینوں پر۔“ انہوں
 نے تھک کر چھٹری پھینکی۔ ”مرے گا کیا۔“
 اندر سے غزل، جیشید اور تاج بیگم شور سن کر باہر
 نکلے۔

”ڈلیا ہوا کیا، دادی۔“
 ”ارے یالم! جیشید کی باچھیں کھل گئیں۔“ تم

آگے یار۔“
 ”ہاں! تو پھولوں کا ہار ڈال اس کے گلے میں۔ گھر
 کے دھندوں کے جان چھوٹی۔“ دادی طنز سے بویں۔
 ”شکر ہے یالم تم آئے۔“ غزل نے ناک چڑھائی۔
 ”تیرے منہ کے تو خندق ہے۔“ دادی نے اسے
 گھورا۔ ”وگلی یالم، یالم کرنے۔“

”ذرا سا آرام کر لو تو کچن سنبھالو۔“ تاج بیگم کو
 اطمینان ہوا۔ ”چائے بنا کر رتن دھولینا“

”بس یہی کرے گا اب سب کچھ سب محتاج
 ہوئے اس کے۔“ دادی بڑبڑائیں۔
 یالم کو دیکھ کر سب ”ایزی“ ہو گئے تھے دادی مگر
 کر رہ گئی تھیں۔

اُمم! اپنے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
 خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
 پیاری شمی!

سلام محبت (اول اول) پیش خدمت است!
 جیشید اپنے چشمہ شہادت کی انگلی سے پیشانی تک
 دھکیلا اور ناک پھول چڑھائی۔
 ”یہ کیا لکھ دیا ہے؟ یہ تو خود میری سمجھ میں نہیں

آ رہا!“
 ”آپ پورا پڑھا لیں۔“ وہ مصروف انداز میں بولا۔
 ”آپ کو بعد میں شہادت لکھ دوں گا۔“
 ”اچھا!“ وہ مطمئن ہو کر پھر سے پڑھنے لگا۔
 ”اچھا! یہ قسمت میں مڑی صورت نقل ایچ

تھا لکھا یا تم نے لکھ لیا؟“
 ”آپ ہمارے گھر میں آئیں، یوں گا گلستان میں بہار
 چلی آئی ہو۔ لیکن ابھی مشام جاں اس بہار کی خوشبوں
 سے معطر بھی نہ ہو پائی تھی کہ آپ پڑھائی کا بہانا کر کے
 ہم سے دور چلی گئیں۔“

”یار! جیشید نے تحریر پڑھنا ترک کر کے پھر سے
 چشمہ پیچھے دھکیلا۔ ”یہ تو بڑی گاڑھی گاڑھی باتیں لکھ
 ماری ہیں۔“ ”محبت“ تو بس پہلی لائن میں ہے۔ وہ سمجھے

گی کیلئے!“
 ”بھائی جان!“ ایل نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔
 ”لو کیاں ہمیشہ ٹیڑھا میڑھا اُڑا تر چھا اظہار محبت پسند
 کرتی ہیں۔ سیدھی سیدھی بات انہیں سمجھ میں ہی
 نہیں آتی۔“ ”میں تم بات پسند کرتی ہیں۔“ مبہم!“

”اچھا!“ وہ مبہم مسکرایا۔ ”پھر آگے پڑھو؟“
 ”پڑھو پڑھو۔ جو سمجھ نہ آئے پوچھ لیں۔“

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
”یار جنید!“ وہ پریشان ہوا۔ ”یہ مرنے مارنے کی
باتیں کیوں لکھ دیں یار! پیار محبت کی باتیں لکھو، عشق و
عاشقی کے قصے ہوں اور ایہ شوخ کی جگہ شمشاد ہی لکھ دو
اپنی طرح ہے؟“

”بھائی جان!“ جنید نے بین رکھ دیا اور اس کی
جانب متوجہ ہوا۔ ”میں نے پچاس روپے لے کر خط
آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے جو
پیشکش کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور اپنی طرح سوچ
لیں کہ شمشاد، دل شاد اور ارشاد میں سے کیا لکھنا ہے۔
پہلا پہلا خط ہے، ابھی سوچ سکتے ہیں بعد میں کوئی
جانس نہیں۔“

”اچھا!“ وہ فکر مندی سے بولا۔ ”ہاں! سوچ لوں۔“
نہیں یار! شمشاد ہی ٹھیک ہے، جمشید جیسا ہی لکنا ہے
اور وہ ہے بھی سب سے زیادہ سب سے گوری۔
”ٹھیک ہے پھر نامہ بر کے متعلق ابھی کچھ سوچا۔“

”یہ تو آپ کا مقصد ہے کہ خط کیسے
بھجوائیں گے؟“
”یوسٹ کر دیتا ہوں۔“

”ناشاء اللہ! اور یہی منزل تو بہت چالو ہے آپ
کی۔ بناتیشے کے سر پھاڑنے کے لئے طے سوچ
لا رہے ہیں آپ کو۔ وہ تو جلی جائے گی بالکل لکھ اور پیچھے
سے بذریعہ پوسٹ پہنچنے والا خط انکل خورشید علی یا
آئی نور بانو ہی کھولیں گی۔ آپ نے شاید ان کے کچن
میں وہ مسالا پیسنے والی کوئٹی اور اس کا پلینڈ ڈنڈا نہیں
دیکھا۔ جناب! وہ لوگ سامان شفٹ کر رہے تھے تب
میں نے ہی وہ اٹھا کر اوپر پہنچائے تھے۔ اس دن سے
میں نے ان تین حسیناؤں میں سے کسی سے بھی محبت
کرانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا، لیکن آپ واقعی فرما دی
ماند جواں مرو ہیں۔ سنبھلوٹ فار یو!“

جمشید کچھ سوچنے لگا تھا۔
”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں انے سوچ لیا

”ہے۔“
”کیا؟“
”نامہ بر کا نام!“
”وہ کیا؟“ جنید نے اسے دیکھا۔
”بالم!“ وہ مسکرا دیا۔



”ارے او چوٹے! ادھر آ مرو دو!“ دادی کی پاٹ دار
آواز اور خطرناک قسم کے تیوروں نے انگلی پر کپڑے
ڈالتے ہوئے بالم کو سہا دیا۔

”جی دادی۔“ وہ ڈرتا ہوا ان تک پہنچا اور ان کے
سرہانے رکھی ہوئی چھتری کو دزدیدہ نظروں سے دیکھنے
لگا۔

”میرے سرہانے سے پچاس روپے کا نوٹ نکالا
جے نالوٹے؟“ انہوں نے مشکوک نگاہوں سے اسے
دیکھا۔

”نہیں دادی۔ اللہ قسم۔ میرے باپ کی توبہ۔“
اس نے کان پکڑے۔

”خوب یاد ہے مجھے۔“ بچھلے پہلو میں نے رکھا تھا
یہاں یہ ریزگاری پرچی ہے لیکن نوٹ غائب ہے۔
پھر یہ جلیڈ کا کام ہے۔ اسے ہی نوٹوں کی ضرورت ہے
آج کل۔۔۔ پرانی لڑکیوں سے مانگ لیتا ہے دادی سے
مانگتے شرم آتی ہے، دکم جخت کو۔۔۔ چوری کرتے شرم
نہیں آتی۔۔۔ آنے دواسے سمجھتی ہوں میں۔“

”بالم۔۔۔ یار بالکے۔“ جمشید نے کمرے سے سر
نکالا۔ ”یار! فارغ ہو تو ذرا آنا۔“

”تم اس قدر فراغت سے ہو تو اس غریب کو فارغ
ہونے کا موقع کہاں ملتا ہے۔“ دادی نے اسے جواب
دیا۔ ”یہ آیا اور سب کی عید ہوئی، بے چارا قربانی کا
بکرا۔“

”ہی ہی۔۔۔“ وہ شرما کر انگلی کے پاس سے پاکستانی
ہیروئن کی طرح بل کھا کر دور چلا گیا۔

”نوٹنگی کہیں کا۔“ دادی اس کی حرکت سے جل
گئیں۔

”بھائی جان!“ اس نے اندر جھانک کر پوچھا۔

”میں آجاؤں؟“
جشید بے تابی سے اس کی جانب بڑھا۔ بالم کا ہاتھ
کھینچ کر اس نے اندر کیا اور دروازے کی کنڈی لگادی۔
”ہائے اللہ بھائی جان! یہ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ

چلایا۔
”ارے چپ کرو۔“ جشید نے گھبرا کر اس کے منہ
پر ہاتھ رکھا پھر جھلا کر مٹایا۔ ”ایک تو یہ تمہارے
دانت۔“

”ہی ہی ہی۔۔۔“ اس نے فوراً نمائش کی۔
”اندر کرو! نہیں۔“

اس نے فٹ منہ بند کر لیا۔
”یار بالم!“ جشید نے قدرے خوشامدی انداز
اختیار کیا تھا۔ ”ایک کام ہے تم سے کرو گے تا۔۔۔“
”سارے کام تو کرتا ہوں بھائی جان! وہ ایک بھی
کروں گا۔“

”یاد دینے۔۔۔ ایک۔۔۔ ایک کاغذ لے۔۔۔“ اس
نے دُرتے دُرتے چپ سے تھپکیا ہوا خط نکالا۔ ”
کسی کو دینا ہے۔۔۔“
”کس کو دوں؟“ اس نے کاغذ اچھل لیا۔ ”باجی
کو؟“

”ارے باپ رکے۔۔۔ مروا ہے گا مردود؟“ اس نے
اداوی کی زبان استعمال کی۔ ”اپنے گھر آئیے یہ کسی کو
نہیں دینا، کبھی ایسے ذکر ہی نہیں کرنا اس کا۔۔۔“
”اداوی سے بھی ٹھیل!“

”او خبیث۔۔۔ حواسوں میں آجائے گیوں میرے
گلے میں راستی بندھوانے کی ترکیبیں سوچ رہا ہے۔“
”پھر بتائیں نا بھائی جان! کس کو دوں؟“ وہ اکٹا گیا۔
”یہ لے دس روپے تیری خرابی ہے!“ جشید نے
اُدھر اُدھر دیکھ کر دس کانوٹ اس کے حوالے کیا۔

بالم خوشی سے کھل اٹھا۔
”میں صدقے بھائی جان! میں واپس آؤں گا۔“
”اب کتنے؟“ جشید اس کے کان میں سرگوشیاں
نے لگی۔

”یار جنید! آخر جوانی محبت نامہ کب موصول ہوگا؟
میں انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گنتی بھولے ہو
ہوں۔“

”بھائی جان! عاشقی صبر طلب کام ہے۔ تنہائی آواز
پر کان لاندو ہریں۔“

جشید نے جھلین بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔
”تم کتنے بدل گئے ہو میرے بھائی! ایسی عقل
فراسیت پہلے کبھی تمہارے بے وقوفانہ سراپے سے
جھٹکی تھی۔“ آخر اس تبدیلی کا راز کیا ہے؟ کبھی اس
نجستہ خان کی وجہ سے تو یہ تبدیلی نہیں آئی؟

جنید نے سر د آہ بھری۔
”یار جنید! اندازہ لگایا آپ نے بھائی جان! یہ سب
اسی نجستہ خان کی کرشمے ہیں۔“

”واہ میرے بھائی! محبت ہو تو ایسی آلو کو لومڑی
ڈالا۔“

جنید نے سر اٹھا کر بد مزگی سے اسے
دیکھا۔

”مثال دینے میں تو آپ ہمیشہ سے بے مثال رہے
ہیں بھائی جان! ایسے اطمینان عرض ہے کہ یہ محبت
نہیں رقاقت کا کڑوا شہتہ ہے جہاں وفا نہیں جفا سرگرم
عمل ہے۔ وہ دھوکہ باز حسینہ میرے سب فوس اے
ہضم کر گئی جیسے کسی مشہور ماہنامے کی ردی کی ٹوکڑ
ہو اور میرے سامنے وہ ڈکالینا بھی گوارا نہیں کرتی۔“

”چچ چچ۔۔۔ جب ہی میں کنوئیں کچھ دنا سے
تمہاری اظہورت کلوادھولی کے گدھے جتنی لمبی کیلا
لگ رہی ہے۔ تو یہ ہے یا نہیں کا سبب غم نہ کرو میرے
بھائی! میں تمہارے اس غم میں برابر کا شریک ہوں۔“

”ارے۔۔۔ میں بھائی جان! یہ شراکت داری آپ کو
راس نہ آئے گی۔ ابھی آپ کو ”پ“ غم کا بوجھ بھی
پورا پورا اٹھانا ہوگا، کیونکہ میں اس میں ہرگز شراکت
داری نہ کروں گا۔ کلوادھولی کے گدھے کا ذکر اس
وقت تک کے لیے اٹھانا نہیں۔“

اسی لمحے بالم اپنی پتلی کمر پر چکنا چکنا دھان سے گزرا۔
”ارے ارے رے رے سنو بالم۔ او بانگے۔“

جمشید نے گھبرا کر اسے آوازیں دیں۔
”چائے کا وقت گزر چکا ہے بھائی جان! باجی کہہ
رہی تھیں، چائے صرف دو ٹائم بنے گی۔“ وہ مصروف
انداز میں گھبرا کر بولا۔

”ارے توپ کا گولہ مارو چائے کو، ادھر آؤ تم۔“ وہ
جھلایا۔

”جی، کیسے۔“ بالم نے قریب آکر کہا۔
”وہ وہ ڈنڈہ دیا؟“

”وہ؟ وہ کیا؟“ وہ الجھا کر بولا۔
”ارے وہی۔ وہی۔“

”خط کہہ دیجئے بھائی جان! کوئی حرج نہیں۔“ جنید
کھل کر بولا۔

”وہ میرا خط۔“ وہ بولی اور آڑیں بولا۔
”ہاں جی، آئی کو دے دیا۔“ وہ کہہ کر جاسٹینے لگا تھا۔

”ہائیں؟“ وہ دونوں ہکا بکارہ گئے۔
پھر جمشید نے جست لگا کر اس کی گدی پکڑی۔

”بھائی جان! چھوڑیں مجھے۔ باجی۔“ وہ کیسی
آوازیں دینے لگا۔

جنید نے لپک کر اس کا ہاتھ بندھ لیا۔
”اے چپ کر، ورنہ دوں گا ایک مرکا۔“

وہ سہم کر خاموش ہوا گیا۔
”ہاں اب بتا۔“

”جمشید بھائی جان نے کہا تھا، وہ جو سب سے گوری
باجی ہیں، ان کو وہ کانغہ دے دیتا۔ میں اوپر گیا تو اٹکل لیا

خورشید، چاچا میاں اور آئی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔
ان میں سب سے گوری آئی تھیں، تو میں نے وہ کانغہ

ان کو دے دیا۔
”ہاں۔“ جمشید تورا کر بستر پر گئی۔

”اے بے وقوف!“ جنید نے اسے ٹیلیک دھب
رہی کی۔ ”بھائی جان نے ان کی بیٹیوں کے لیے کہا

تھا۔“

”تو جی۔ وہ تینوں تو واپس چلی گئی ہیں۔ میں ان کو کسے رستا؟“ وہ گردن سہلانے لگا۔ جنید مظلوم صورت بنا کر کچھ سوچنے لگا۔

”ہاں بس۔“ اس نے ناک چڑھائی۔ ”ایسے ہی فضول فضول موقعوں پر بہن کی یاد آتی ہے۔ ویسے تو کبھی میرا نام نہیں لیتے آپ دونوں اور بھائی جان! کتنی خراب حرکت کی ہے آپ نے۔ اب میرا سامنا ہو گا ان لڑکیوں سے تو مجھے کتنی شرم آئے گی۔“

”پیارے بہنا! افسوس کا مقام تو یہی ہے کہ ان لڑکیوں تک بات پہنچی ہی نہیں۔“ اس نے آہ بھری۔

”وہ ایک معصوم سا اظہار محبت تھا، سومن چرس تو نہ تھی جو رستے میں ہی دھری گئی۔“

”تو اب میں کیا کروں؟“ وہ بھائی سے پوچھ کر بھی کیا سکتی ہوں؟“

”تم اوپر جا کر حالات کا جائزہ لے کر آؤ۔ حالات و تاثرات و واقعات نوٹ کر کے ہمیں اشہری دو۔“ جنید بولا۔

”معاملات میں قدر انگریزوں کے ہیں، پارلیمنٹ سے مشاہدہ کرو۔ بات بننے کی سبیل کیا ہوا سکتی ہے، مشورہ دو۔“

”ہاں۔ میں مارا کھاؤں۔“ آپ دونوں چھپے بیٹھے رہیں۔

”دو نہیں میری بہن۔ یقین کرو۔ ہم مارا کھانے میں تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔“ جمشید جذب سے بولا۔ غزل نے غصے سے سر جھٹک دیا۔

غزل جاں فزار پورٹ لے کر آئی تھی۔ ان دونوں کے مرجھائے ہوئے چہرے جی اٹھ گئے۔

”آئی کو تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ انہوں نے نا۔ مجھی سے وہ کاغذ ڈانٹنگ میبل پر نمک دانی کے نیچے رکھ چھوڑا ہے لیکن ان کا ارادہ ہے کہ وہ شام کو خورشید انکل سے وہ تحریر پڑھوائیں

گی۔ دراصل وہ سمجھ رہی ہیں کہ وہ کاغذ شمشاد باڑی کی پڑھائی سے متعلق کوئی چیز ہے۔“

”اوہ۔ کس قدر درست سمجھتی ہیں وہ۔“ جمشید نے دانت نکالے۔ ”واقعی وہ؟“ انہی کی پڑھائی کی چیز ہے۔“

”دانت اندر کریں بھائی جان اور یہ سوچیں کہ وہ واپس کیسے لیا جائے۔ خورشید انکل، آئی نور بانویسہ ساہو لویج ہرگز نہیں ہیں۔“

”تم کئی تھیں تو لے آئیں۔“ جمشید غزل پر بگڑا۔

”آئی ہاں۔ احسان ماننا تو ایک طرف۔ لے لے لے دھرنے۔ یا مین پھلا کیسے لے آتی؟ اتنی بات بھی میں نے بڑی مشکلوں سے اگلوائی ہے، وہ تو نجانے کیا کیا بولتی رہتی ہیں۔ وہ تو شکر کریں جس وقت بالم خط سے کر آنا، خورشید انکل کا ضروری فون آگیا، ورنہ وہ تو اس وقت ان سے پوچھوا لیتیں۔ اب انہوں نے انکل کے انتظار میں اسے ڈانٹتے ہوئے رکھ چھوڑا ہے۔“

”کچھ کرو میرے بھائی! جمشید نے آہ بھر کر جنید کو دیکھا۔

”ان کی ڈانٹنگ میبل بلاؤنچ کی مغربی دیوار سے لگی رکھی ہے۔“ جنید پر خیال انداز میں بولا۔

”ہاں تو ہاں بیٹھ کر وہ مزے مزے کے کھانے کھا رہے ہیں۔“ جمشید بھی خیالوں میں مسکرایا۔ جنید نے اسے بری طرح سے گھورا۔

”میں نے تصور کی دنیا فی الوقت اس کونڈی اور ہیلپر ڈنڈے کے لیے آیا ہے۔“ بھائی جان! جو ان کا کھانا پکانے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے آگے جانا منع ہے۔“

”صحیح کہتے ہو برا درم!“ اس نے سرد آہ بھری۔

”اس کے کونڈی اور ڈنڈے کے ساتھ ساتھ میرے تصور کے کینوس پر وادی جان کی چھڑی اور ابو جی کا جوتا بھی پینٹ ہو چکا ہے۔“

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس دیوار میں ایک کھڑکی

78

بڑی۔
 ”اے کہنے میں دساں تینوں سپردِ ادا پتیر۔“
 وہ ازل کو پکڑنے لگے۔ جنید برق رفتاری سے کرسی
 سے اٹھ گیا۔ چاچا جی گری پر جا گرے۔ آنٹی نور بانو
 حیران پریشان سی ساری کارروائی دیکھتی رہ گئیں۔
 ساوہ بہرِ قلع ٹھوڑی پر کس کر پکڑے ہوئے وہاں سے

وہ صحن میں پہنچ کر برق رفتاری سے سیڑھیوں کی
 ریٹھا چڑھ کر نیچے کود گیا۔ صحن میں سوئے لڑکا اسی وقت
 قسمتی کوئی نہ اٹھا۔ وہ ایک چھلانگ ہمارا کر اپنے کمرے
 میں گھس گیا اور کندی پر چڑھ کر گہرے گہرے سانس
 اٹھانے لگا۔

چاہا جاتی بھی نہیں اس کی سزا ہے۔ اسی کی طرح
سیرٹھوں سے کوڑے تھے لیکن اگلے ہی لمحے ہاتھ روم
آئے غسل کر کے باہر نکلتی داوی جان سے اٹھرا گئے۔
”ہائیں۔“ داوی کا کارہ گہری۔

”رستم کی اولاد میں جتنی ہوتی تھی۔۔۔ تو آیا کیسے
میرے صحن میں۔۔۔“ وادی جان اپنا آرمودہ ہتھیار
سنجھالے ان کے پیچھے لپکیں۔

”پانچ سو؟“ جمشید ہونق ہو گیا۔ اٹھنیرے پورے

پورا کمانڈو ایکشن تھا۔ کسی قسم کی مچھرنی نہ تھی، جہاں اور عزت دونوں سخت خطرے میں تھیں۔

”ٹھیک کہتے ہو۔“ جمشید منمنایا۔

”ہائیں۔“ کاغذ کھول کر وہ ہونق رہ گیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

مسترد کلو

”یہ کیا ہے؟“ وہ چلا گیا۔ ”یانچ ہنور بچے میں یہ سبزی کی لسٹ؟“

”باغِ خراب ہو گیا ہے عتو کا تاج بیگم سبزی
 کی نوکری سیلے بستی ہوئی آگ کی جھینگر۔ جمشید نے
 جلدی سے کاغذ چھپایا۔ جنید نے نوٹ جیب میں ڈال
 لیا۔

*** ”اے اے خوشنوی فروش آج بڑے موڈ میں تھا۔ ایک کاغذ چاٹنے رکھے لہک لہک کر شعر سنارہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”بابی! مر جا گالپ سنو گی؟“

بولے: "ہاں ہاں، یہی شعر تھا۔"

”ہاں، کب کا۔“ وہ ٹوکری سنبھالتی یجن کی طرف

دونوں بھالی ہاکھ پر ہاکھ مار کر بس دیے۔

